اخلاص عمل

تحریر: محمود مرزا جہلمی چیف ایڈیٹر ہفت روزہ ''صدائے مسلم'' جہلم

اسلام اپنے تمام عقائد، عبادات اور اعمال میں اخلاص کو آخری غایت قرار دیتا ہے۔ توحید جو اسلام کا بنیادی پتھر ہے، اس میں اخلاص کا اتنا زبردست مطالبہ کرتا ہے کہ اس میں رائی کے دانے کے برابر ملاوٹ اور نہاں خانہ خیال میں بھی غیر اللہ کے تصور کو برداشت نہیں کرتا۔ عقیدہ رسالت میں بھی اس قسم کا زبردست اخلاص لازمی قرار دیا۔ عقیدہ توحید میں جس طرح شرک نا قابل معافی ظلم ہے اسی طرح، حضور اقدس ﷺ کی سنت میں بدعت کو گمراہی اور اس گمراہی کو فی النار ٹھہرایا گیا ہے۔

اخلاص کا تقاضا یہ کہ ہر مسلمان صدق دل سے یہ ایمان رکھے کہ اللہ احکم الحاکمین کائنات کا مطلق العنان حکمران ہے۔ وہی اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس کیلئے قوانین پر مشتمل ضابطہ حیات مقرر کرے۔ وہ اس بات پر بھی سچے دل سے ایمان رکھے کہ اس کے مقرر کردہ ضابطہ حیات سے بہتر کوئی طریقہ کار ممکن ہی نہیں۔ پھر سچے دل سے یہ بھی ایمان رکھے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ضابطہ حیات پر جس طرح عمل کر کے اپنا اسوۂ حسنہ قائم کیا جسے آپ ﷺ کی شریعت کہا جاتا ہے، اس سے بہتر طور پر اس ضابطہ حیات پر عمل ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ عقائد کے اخلاص کے نمونے ہیں۔ قرآن مجید ان سارے مطالب کو ﴿مخلصین له الدين﴾ کے ذریعے بیان کرتا ہے۔

قرآن مجید میں مسلم حنیف کا بیان ہوا ہے یعنی ایسا مسلم جس کا دھیان کسی بھی وقت کسی مرحلہ میں اور کسی بھی حالت میں اخلاص سے خالی نہ ہو۔ مثلاً اگر وہ راستے میں سے ایک کانٹا بھی اٹھائے تو وہ اس لئے اٹھائے کہ ایسا کرنے کا حکم رسول اللہ نے دیا تھا۔ اور اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے۔ اخلاص عمل یہ ہے کہ ہر عمل نبی اکرم ﷺ کی سنت کے تحت ہو اور اس کی غرض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہو۔ رضائے الٰہی کے حصول کی نیت ہی اخلاص کہلاتا ہے۔ حدیث شریف (**انما الاعمال بالنيات**) کا یہی مفہوم ہے۔ عمل کے پیچھے جو جذبہ اور ارادہ کارفرما ہوتا ہے، وہی فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ قربانی کے متعلق قرآن مجید میں مذکور ہوا ہے کہ ''گوشت اور خون اللہ تعالیٰ کو نہیں پہنچتا بلکہ صرف تقویٰ اللہ تعالیٰ کے نزدیک فیصلہ کن شے ہے''۔ یہی تقویٰ نیت اور جذبہ ہے۔ تقویٰ اللہ تعالیٰ سے ڈر جانا ہے۔ کوئی بھی عمل یا اقدام کرنے سے پہلے یہ دیکھنا اور سوچ لینا کہ کہیں اس سے اللہ تعالیٰ ناراض تو نہ ہو جائیں گے اور اس ناراضگی سے ڈر کر اس عمل سے باز رہ جانا ہی متقی لوگوں کا کام ہے۔ اخلاص عمل کا آخری درجہ یہ ہے کہ مسلم کو ایک فائدہ حاصل ہو سکتا ہے مگر وہ اس سے، اس لئے دستبردار ہو جاتا ہے کہ اس کا حصول اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے۔

سود ہمیشہ ہی انسانوں کیلئے پرکشش رہا ہے۔ یہ ایسا فائدہ ہے جو بہت آسانی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں تو اس کے حصول کی ترغیب دینے کیلئے پروپیگنڈے کی زوردار مہمات چلائی جاتی ہیں مگر مخلص مسلمان اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا کیونکہ اس کا رب تعالیٰ اس کو حرام ٹھہراتا ہے۔

اخلاص عمل کی ضد ریاکاری ہے۔ قرآن پاک ''سورۃ الماعون'' میں ﴿ھم یرائون الناس﴾ کے کلمات کے ذریعے، اس کی مذمت آئی ہے۔ میدان حشر میں کئی مجاہدین کا جہاد، کئی علماء کا علم و وعظ، کئی اسخیا کی سخاوت اور کئی ازکیا کی زکاوت مسترد کر دی جائے گی کہ وہ لوگوں کو دکھانے کیلئے تھا۔ مجاہد نے جہاد تو فی سبیل اللہ ہی کیا تھا لیکن اس کی غرض یہ نہ تھی کہ وہ اس کے ذریعے اپنے رب تعالیٰ کی رضا چاہتا ہے بلکہ یہ تھی کہ عوام اسے بہادر کہیں گے، یوں یہ سب سے بڑا عمل رائیگاں جاتا رہا۔ دکھلاوا بھی ایک احمقانہ فعل ہے ریاکار بڑا نادان ہوتا ہے۔ سخاوت دونوں طرح پر درست ہے، ''سراً وعلانیۃً'' اگر سخی، سخاوت پوشیدہ کرے اور نیت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہو تو بھی جو لوگ اس کی سخاوت سے فیض یاب ہوں گے، اس کی سخاوت پر گواہ ہوں گے اور دنیا میں اس کی دریادلی اور انسان دوستی کا ذکر خیر بہرحال کریں گے جس سے سخی کی شہرت ہوتی جائے گی۔ بات تو پھر وہی ہوئی کہ عوام میں وہ سخی مشہور ہو گیا لیکن اس صورت میں اس کا اخلاص برقرار رہا اور وہ عند اللہ محمود و ماجور ہے۔ اعلانیہ سخاوت بھی اگر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی نیت سے ہو گی تو اللہ تعالیٰ بہرحال راضی ہوں گے کیونکہ اس سے دوسروں کو سخاوت کرنے کی ترغیب ہو گی جس سے اللہ تعالیٰ مزید خوش ہوں گے بلکہ اس کی قائم کردہ نیک مثال کو اپنا کر جتنے لوگ راہ جود و کرم اپنائیں گے، وہ صدقہ جاریہ کے طور پر اس کیلئے مستقل ذریعہ ثواب ہو گا۔

نماز تو خالصتاً ظاہری عمل ہے۔ یہ تو کسی طور پر بھی چھپ کر ادا نہیں ہو سکتی۔ وہ نمازی بڑا ہی نادان ہو گا جو اپنی نمازیں دکھلاوے کیلئے پڑھتا ہے۔ نماز تو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے پڑھے اور اسی جذبے سے مسجد میں جائے، رہی شہرت تو خود بخود ہی مل جائے گی کہ فلاں صاحب بڑے نمازی ہیں۔ پس ہمیں تمام اعمال اس اخلاص نیت سے کرنا واجب ہیں کہ ان کے ذریعے ہم اپنے رب تعالیٰ کو خوش کر رہے ہیں۔ دعا، عبادت کا مغز ہے۔ کچھ دعائیں تو نماز کا حصہ ہیں، مگر بندوں کی حاجات بے شمار ہیں۔ قرآن پاک اور حدیث شریف میں ہر قسم کی حاجت طلبی کیلئے دعائیں فرمائی گئی ہیں۔ وہ سب دعائیں اسی لئے سکھائی گئی ہیں کہ مسلمان ان کے ذریعے اپنے اللہ سے اپنی حاجات طلب کریں۔ دو رکعت نماز حاجت کا پڑھنا مسنون ہے۔ نماز فرض کے بعد دعاؤں کی قبولیت کی گھڑی ہوتی ہے۔ نماز عصر کے بعد جب فرشتے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ ان سے بطور خاص دریافت فرماتے ہیں کہ ان کے بندے ان سے کیا مانگتے ہیں اور فرشتوں کو گواہ بنا کر ان کی دعائیں قبول فرماتے

ہیں۔لیکن یہاں یہ باریک نکتہ سامنے رہنا چاہیے کہ غرض نماز صرف اور صرف رضائے الٰہی کا حصول ہے۔وہ بادشاہ راضی ہوگا تو بہت سا انعام بن مانگے ہی دے دے گا۔

بعض اہل علم وعمل عبادت بے ریا سے بھی آگے جاتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اخلاص کی معراج یہ ہے کہ بندہ مخلص وہ ہوتا ہے جو اسی حد تک راضی برضا ہو جو رضائے الٰہی کے الٹ دعا بھی نہ کرے۔مثلاً اگر وہ بیمار ہوتو اسے اپنے رب کی رضا سمجھے اور شفا کی دعا بھی نہ کرے۔اگر وہ بھوکا ہوتو اپنے رازق و مالک سے اپنی بھوک کا مداوا بھی نہ طلب کرے وعلیٰ ھذا القیاس اس سلسلے میں وہ حضرت ایوب علیہ السلام کی مثال پیش کرتے ہیں کہ وہ اپنی طویل علالت کے دوران اس حد تک راضی برضا رہے کہ مبینہ طور پر ان کیڑوں کو پھر سے اٹھا کر اپنے زخموں میں رکھ دیتے جو زمین پر گر پڑتے تھے۔ہم نے اس روایت کی تا مقدور تحقیق کی ہے مگر یہ ایک بے اصل افسانہ ہے۔قرآن میں ان کا دعائے صحت کرنا ثابت ہے۔اسی طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام جب مدین پہنچ گئے اور شعیب علیہ السلام کی بکریوں کو پانی پلا چکے تو اپنی بھوک اور بے سروسامانی کا حوالہ دے کر اپنے رب سے اس کے تدارک کی دعا کی۔قرآن پاک میں یہ مضمون مفصل طور پر بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے جان و مال میں نقصان کے ذریعے ان کا امتحان بھی ضرور لیتے ہیں اور ساتھ ہی واضح طور پر حکم دیا کہ ایسے کسی بھی امتحان وآزمائش میں نماز خوب عاجزی کے ساتھ پڑھو۔آزمائش وابتلا کے دوران کم ہمتی اور ناشکری نہ کرو۔اس آزمائش کو نماز اور صبر کے ذریعے کاٹو۔شکوہ شکایت نہ کرو۔اپنی قسمت کو کوسنے نہ دو اور جو جو مشکلات وارد ہوں ان پر ﴿ انا لله و انا اليه راجعون﴾ کا ورد کرو۔یہ سب کچھ کر کے ''واستعينوا'' کے حکم کے تحت اپنی مشکل کشائی بھی اللہ سے طلب کرو۔حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عالم پیری میں اولاد کی دعا کی جبکہ ظاہری حالات کے بموجب بے اولادی مقدر ہی نظر آتی تھی۔ اور اس کا حوالہ بھی دیا گیا کہ اگر مریم کو بے موسم پھل مل سکتے ہیں تو ہمیں پیرانہ سالی میں اولاد بھی عطا ہو سکتی ہے۔تقدیر تو یہی ہے کہ پھل اپنے موسم میں ہی ملتے ہیں اور اولاد کے متعلق تقدیر تو عمر کا ایک خاص دور ہی ہے۔مگر دونوں پیغمبروں نے تقدیر کے ظاہری فیصلے سے ہٹ کر دعا کی۔سو ہم راضی برضا ہونے کی یہ معراج اس مفہوم میں قبول نہیں کر سکتے کہ بیماری میں دعائے صحت بھی نہ کی جائے۔ہمیں ہر عبادت پر اجر وثواب کے وعدے سے خوش کیا جاتا ہے اور جنت کی طلب کا سلیقہ سکھایا گیا ہے۔مگر اس ضمن میں بھی ایک ایسی فکر کی پرورش کی جاتی ہے جو اسلام کی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتی۔غالب کا یہ شعر اسی ناقص مفہوم کا حامل ہے۔

طاعت میں تا نہ رہے مے و انگبیں کی لاگ　　دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کے بہشت کو

اس شعر میں قائل کا مقصود یہ ہے کہ جنت کو کوئی اٹھا کر دوزخ میں ڈال دے تاکہ عبادت کرنے والے کے پیش نظر جنت کی شراب طہور اور شہد کا لالچ نہ رہے۔ شاعر کہنا تو یہی چاہتا ہے کہ عبادت صرف رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر ہونی چاہیے اور عابد کے سامنے دیگر کوئی مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ مگر قرآن کریم اس فکر کی تائید نہیں کرتا۔ قرآن نے خود ایسی دعائیں سکھائی ہیں جو نماز میں پڑھی جاتی ہیں جن میں اپنے لئے، اپنے والدین کیلئے اور جملہ مومنین کیلئے دعائے مغفرت کی جاتی ہے۔ دوسری مسنون دعا یہ ہے۔ ''اے اللہ میں نے اپنی جان پر بڑا ظلم کیا ہے۔ تیرے سوا گناہوں کو معاف کرنے والا کوئی نہیں۔ مجھے اپنی جناب سے مغفرت عطا فرما اور مجھ پر رحم فرما۔ بیشک تو بخشنہار اور رحم کرنے والا ہے۔''

ان دعاؤں پر نظر کریں تو اصلی بات یہ بنتی ہے مغفرت طلبی دراصل اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ہی نام ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی یہ نہیں ہے کہ بندہ اس سے اپنی مشکل کشائی کی درخواست نہ کرے یا اپنی حاجات اس کے دربار میں پیش نہ کرے۔ مغفرت جو حور و قصور جنت کی صورت میں متشکل ہوگی، اسے رضائے الٰہی سے کوئی الگ شے نہ خیال کرنا چاہیے۔

قرآن نے یہ مضمون بھی شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرماں بردار بندے سے فرمائیں گے ''تو اپنے رب کی طرف راضی برضا ہو کر آ جا۔ میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا'' گویا راضی برضا ہونا تھا ہی اس لئے کہ اسے جنت عطا ہوگی اس لئے حصول جنت کی دعا و تمنا اور اپنی عبادت کے صلے میں اس کی طلب کسی بھی لحاظ سے اخلاص عمل کے منافی نہیں ہے۔ رضا جوئی کا مفہوم اس مثال سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔ ہم اللہ کے دربار میں اپنی کوئی حاجت پیش کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ اس کی قبولیت اس طرح نہیں فرماتے جس طرح ہم نے عرض کیا تھا بلکہ کسی اور طرح اسے شرف قبولیت بخشتے ہیں تو ہمیں ان کے اس فیصلہ پر بھی راضی اور شکر گزار ہی رہنا چاہیے۔ ایک شخص اولاد نرینہ کی درخواست بارگاہ حمدیت میں پیش کرتا ہے۔ مگر اسے بیٹیاں ہی عطا ہوتی ہیں یا سرے سے اولاد دی ہی نہیں جاتی تو اسے شکر گزار ہی رہنا واجب ہے۔ اسی کا نام راضی برضا ہونا ہے۔ مگر بیٹے کے حصول کی دعا بھی ترک نہ کرے کیونکہ ترک دعا مایوسی ہے اور مایوسی کے عالم میں انسان رب سے دور اور ابلیس کے قریب ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ کہ کوئی شخص عبادت گزاری اس لئے اختیار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دنیوی حاجات پوری کر دیں تو یہ سنگین غلطی ہے۔ ایسے لوگوں کیلئے سخت وعید ہے۔ آخرت میں ان کا حصہ ختم کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ عبادت گزاری لوجہ اللہ نہ تھی۔ اس میں بے شک خشیت ہو مگر یہ خشیت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے نہ تھی بلکہ دنیوی اغراض کیلئے تھی اس لئے عند اللہ بے غرض نہ سمجھی جائے گی۔ آپ کہیں گے ابھی تو ہم نے یہ کہا ہے کہ مغفرت و جنت کی طلب عبادت کے اخلاص اور للہیت میں کوئی نقص نہیں پیدا کرتی۔ تو دنیوی اغراض کی طلب کیونکر

اخلاص میں خلل ڈالتی ہے تو ہم نے یہ نہیں کہا کہ دنیوی اغراض کی طلب نہ کرنا چاہیئے بلکہ یہ کہا ہے کہ اولاً عبادت گزاری کے پیچھے ان اغراض کی طلب کا فرما نہ ہونا چاہیئے۔ ثانیاً طلب دنیوی اغراض تک ہی نہ رہنا چاہیئے بلکہ آخرت کی بھلائی کی درخواست بھی کرنی چاہیے۔ جمیع نسل انسانی اور بالخصوص جملہ اہل اسلام کی بھلائی تو ضرور ہی طلب کرنا واجب ہے۔

نیت ہی فیصلہ کن امر ہے۔ لباس تبدیل کرنا، بنانا اور صاف ستھرا رہنا انسان کی ذاتی ضروریات میں داخل ہے۔ اب اگر ہم جمعہ کے دن اس نیت سے غسل کریں اور لباس تبدیل کریں کہ یہ حضور اقدس ﷺ کی سنت ہے تو یہ سارا عمل موجب رضائے الٰہیہ ہوگا۔ اور بدنی صفائی جو ہماری ذاتی ضرورت تھی وہ بھی تو بہر حال پوری ہو جائے گی۔

بیماری اور مقدمہ انسان کی جان کے لئے وبال ہے۔ ان حالات میں کوئی بھی شخص خوش نہیں رہ سکتا اور خود اللہ تعالیٰ بھی چاہتے ہیں کہ ان کا بندہ، ان سے بیماری سے نجات اور مقدمہ سے بریت کی دعا کرے اور ہمیں دعائیں سکھاتے ہیں۔ اگر بیماری یا دیگر مصائب ونوائب میں مبتلا رہنا ہی رضائے الٰہیہ کے حصول کا کوئی مفید طریقہ ہوتا تو یہ دعائیں نہ سکھائی جاتیں۔ (

یا حیی یا قیوم بر حمتک استغیث . یا حلیم یا کریم ، اللھم اشف مرضانا و مر ضیٰ المسلمین)

اس لئے یہ کہنا کہ مصائب میں مبتلا رہنا رضائے الٰہیہ پر راضی ہونے کا نام ہے۔ حد درجہ غلط سوچ ہے صحیح عقیدہ یہ ہے کہ بندہ شدائد کا مقابلہ صبر کے ساتھ کرے۔ کم ہمتی اور کم حوصلگی نہ کرے۔ نماز کا اہتمام پہلے سے زیادہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے اور نجات وشفاء کیلئے دعا کرے۔ جتنی مدت بیمار رہے، شکر گزاری میں کمی نہ کرے۔ بیماری یا کسی بھی دیگر سختی کی حالت میں اپنی قسمت کو نہ کوسے بلکہ اسے اللہ کی طرف سے امتحان سمجھ کر اس میں کامیاب ہونے کی کوشش کرے۔ اب آگے دو حال ہیں۔ اول یہ کہ بیماری سے شفاء ہوگئی۔ دوم یہ کہ اسی حال میں موت آ گئی۔ اگر تو اس نے بیماری شکر گزاری کے ساتھ کاٹی تھی تو راضی برضا ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوگا۔ اللہ اسے اپنے بندوں میں داخل کر کے جنت میں لے جائیں گے۔ اور اگر یہی صحت یاب ہوگیا تو یہ ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی شکر گزاری، صبر واستقامت اور نماز کو قبول فرما کر اسے صحت یاب کر دیا۔ گویا دونوں حالتوں میں رضائے الٰہیہ حاصل ہوگئی۔ اور اخلاص عمل ثابت ہوگیا۔

یہ عالم اسباب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پیارے نبی علیہ السلام اور ہمارے آقا و مولا حضرت محمد ﷺ کی حدیث مبارک ہے۔ ''ہر بیماری کا علاج ہے'' بیمار کو شفایابی کیلئے دعا اور دوا دونوں سے کام لینا چاہیے۔ اور اسی طرح ہر مبتلائے آلام کو رنج والم سے گلو خلاصی کیلئے دعا کے ساتھ تدبیر وحکمت کو بھی بروئے کار لانا چاہیے۔ اپنے تئیں حالات کے رحم وکرم پر نہ ڈال دینا چاہیے۔ حضور اقدسؐ کی پوری حیات طیبہ اسی سبق سے معمور ہے۔ آپؐ نے اپنے تئیں ابو جہل کے ظلم وستم کے حوالے نہ کر دیا تھا بلکہ

اس کے مقابلہ کی ہر تدبیر کی اور جب میدان بدر میں عالم اسباب میں میسر ساری قوت لا کھڑی کی تو سر سجدہ میں رکھ کر اس دلسوزی سے دعا فرمائی کہ آسمان سے فرشتے مدد کو اترے۔ فتح کی بشارت پائی حتیٰ کہ جبریلؑ نے وہ جگہیں بھی بتادیں جو روسائے کفار کا مقتل بننے والی تھیں۔ قرآن مجید میں واضح حکم موجود ہے کہ دشمن کے مقابلے کیلئے تمام مادی وسائل اور اسباب جنگ مہیا کرو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رضا یہ نہیں کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہو اور اپنی اس کم ہمتی کو توکل کا نام دے لو اور کار جہاں شیاطین کے حوالے کر دو۔

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا   پھر اس کی تیز دھاری کو مقدر کے حوالے کر

مصاف زندگی میں جہاد کرنا اور اس جہان رنگ و بو میں وہ انقلاب برپا کرنا جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور اس پر ''صبغۃ اللہ'' چڑھانا ہی مرد مومن کی اولین و آخرین ذمہ داری ہے یہی انقلاب لانے کی کامیاب جہد و جہد حضور اقدسؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے کی اور اس دنیا میں جیتے جی ''رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ'' کا سرٹیفکیٹ پایا۔ لیکن یہ اعزاز و اکرام اور یہ فوز عظیم اپنے تئیں بے رحم حالات کے ظالم تھپیڑوں کے سپرد کر دینے سے نہیں ملتا۔ یہ فوز عظیم طاغوت سے ٹکرانے اور اسے مٹانے میں ہر متاع دنیا اور آخر کار سرمایہ جان عزیز بھی پیش کرنا پڑتا ہے اور پھر یہ کہنا بھی فرض ہے

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی   حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

قرآن عزیز کی آواز سنئے ''(اللہ) وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت دے کر بھیجا تا کہ وہ (اس ہدایت یعنی اسلام کو) دیگر تمام ادیان پر غالب کر دے''۔ غور فرمایئے۔ یہ ہے وہ غرض و غایت جس کیلئے نبوت و وحی کے سلسلے قائم ہوئے تھے۔ اور یہ ہے وہ فریضہ جو اس امت وسط نے اس جہان میں انجام دینا ہے۔ جن لوگوں نے یہ فریضہ سرانجام دیا، انھیں اس دار فانی سے رحت سفر باندھنے سے پہلے ہی رضائے الٰہیہ کے پروانے مل گئے۔ اور جنت ان پر واجب کر دی گئی۔ اور جنت کے ان وارثوں نے متاع دنیا میں سے اپنے لئے کیا پسند فرمایا؟ اور اپنے پیچھے اس مادی دنیا کا کیا ورثہ اپنے وارثوں کیلئے چھوڑا؟ ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔ خلیفۃ الرسول سیدنا ابوبکر صدیقؓ اکبر دم واپسیں اپنے فرزند عزیز کو بلاتے ہیں کہ ان کی وفات ہو جائے تو ان کا رہائشی مکان بیچ کر ان کے قرضے ادا کئے جائیں۔ ان کا کرتہ ہی ان کا کفن بنا لیا جائے۔ چنانچہ اس وصیت پر عمل ہوا اور چشم فلک نے یہ دلدوز منظر بھی دیکھا کہ امیر المومنین کے پاؤں ننگے رہ گئے تو ان پر گھاس ڈالی گئی۔ یہ ہے رضائے الٰہیہ کا تمغہ سینے پر سجانا۔ لوگ کہتے ہیں کہ تاریخ برحق مگر اب یہ سماں قائم نہیں ہو سکتا۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ تاریخ کا اپنا ہی یہ فیصلہ ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ اور اگر لوگوں کی بات ہی مان لی جائے تو پھر علامہ اقبالؒ کا قول بھی حاضر ہے۔

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہوکر　　　　تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر۔

ہر بندۂ مومن پابند ہے کہ وہ خوبصورت اور پاکیزہ جہاں پیدا کرنے کی کوشش کرے جو رسول اللہؐ اور آپؐ کے اصحابؓ نے پیدا کیا تھا۔ اپنی غلطیوں کا اعتراف اور استغفار بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ایک بڑا طریقہ کار ہے۔ جب ہم اعتراف جرم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے معافی طلب کرتے ہیں تو دراصل ہم اس ناراضگی سے چھٹکارا چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ہمارا استغفار قبول ہوا تو دراصل ہم پر اللہ تعالیٰ پھر سے راضی ہوگیا۔ اس لئے جملہ مومنین و مومنات کو کثرت سے استغفار کرتے رہنا چاہیے۔ مگر گناہوں سے بچنے کی تدبیر زیادہ افضل ہے۔ استغفار کی روح یہ ہے کہ بندہ اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرے۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ اگر بندۂ مومن سے جہالت میں کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو فوراً اس پر نادم ہوکر توبہ کرے اور نئے سرے سے عہد غلامی باندھے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرمائیں گے اور اس پر رحم فرمائیں گے۔ لیکن یہ عہد بار بار نہ توڑنا چاہیے۔ جاننا چاہیے کہ عہد توڑنا نہایت ہی گناہ کا کام ہے۔ اور پھر یہ بات بھی یاد رہے کہ عہد توبہ اللہ احکم الحاکمین سے باندھا جاتا ہے۔ اس لئے باندھے گئے عہد کو بار بار توڑنا حد درجہ گستاخی ہے۔ اس لئے گناہ کو عادت نہیں بنالینا چاہیے۔ گناہ سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوجاتے ہیں۔

رضا کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ بندہ اپنے اعمال و افعال کے ذریعے اپنے رب تعالیٰ کو راضی رکھنے کی سعی کرے۔ اس کا قرب حاصل کرنے کی جدوجہد کرے۔ جس کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ سجدے کرتے جاؤ اور قریب ہوتے جاؤ۔ سجدہ نماز فرض اور نوافل میں ہوتا ہے۔ سجدے کی وسیع تشریح یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی فرمان و احکام خداوندی کے سامنے سرنگوں کردے۔ دوسرا مفہوم راضی برضا ہونا ہے۔ یہ حصہ بڑا مشکل ہے اللہ تعالیٰ چاہتے تھے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام اپنا بیٹا اس کی رضا پر قربان کردیں۔ یہ امتحان ان سے پہلے اور بعد کسی کا نہ لیا گیا۔ خلیل الرحمٰن نے بیٹے کی گردن پر چھری چلادی اور رہتی دنیا تک راضی برضا ہونے کی مثال قائم کردی۔ کسی کا بیٹا نہ ہوا اور وہ راضی برضا ہو تو یہ بھی عبودیت کا درجہ ہے۔ کسی کا جوان اکلوتا بیٹا مرجائے اور وہ پھر بھی صابر وشاکر رہے تو یہ بھی راضی برضائے الٰہیہ ہونا ہے۔ مگر رضائے الٰہیہ کے مطابق اپنے ہاتھ سے بیٹے کی گردن پر چھری چلانا ذبح عظیم ہے اور راضی برضا ہونے کی معراج ہے۔

خلاصہ اس تحریر کا یہ ہے (ا) اخلاص عقائد توحید میں سے ہے۔ (ب) اخلاص عمل سنت ہے (ج) اخلاص نیت رضائے الٰہیہ کا حصول ہے۔ (د) ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا توکل کے منافی ہے (ر) مصائب و نوائب میں دعا کرنا رضائے الٰہیہ کے منافی نہیں ہے۔ (ص) اسلام کو غالب کرنا فرض ہے۔

اخلاص بمعنی خالص ھونا، ملاوٹ سے پاک ھونا یہ ہے کہ عقیدہ توحید غیر اللہ کی ملاوٹ سے پاک ہو۔ اللہ باری تعالیٰ کی ذات، صفات، عبادات اور اختیارات میں غیر اللہ کی شرکت یا شراکت کا تصور بھی نہ آئے اور اخلاص رسالت یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کو اس طرح مطاع مانا جائے کہ آپ ﷺ کی سنت میں بدعت کو شامل نہ کیا جائے۔ اور آپ ﷺ کی بات کے مقابلے میں کسی کی بات کو ترجیح نہ دی جائے۔

اخلاص بمعنی رضائے الٰہیہ کیلئے ہونا یہ ہے کہ ہر عمل صرف اور صرف اس لئے کیا جائے کہ اس سے ہمارا رب تعالیٰ راضی ہوگا۔ ہر عمل ریا سے پاک ہو۔ عبادات کا اخلاص تو رب کو معلوم ہے کہ وہ لوجہ اللہ ہوں لیکن غور کر کے دیکھیں تو معلوم ہو گا۔ کہ بندۂ مومن کا ہر عمل ہی لوجہ اللہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی کا ہر فعل اس کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ مسلمان مزدور، مسلمان کسان اور مسلمان دکاندار، وعلیٰ ھذا القیاس میدان زندگی میں جہاں جہاں مرد مومن کارفرما ہے۔ اگر تو اس کی ساری کاروائی رزق حلال کمانے کی غرض سے ہے تو یہ پوری کاروائی عبادت میں داخل ہے۔ میدان زندگی کی کشاکشی کے دوران نمازیں بھی پڑھی گئیں، روزے بھی رکھے گئے۔ اور رات کو تھکن سے چور جب سو گیا تو سبحان اللہ، اس کا سونا بھی عبادت میں شمار ہوگا۔

یہ کتنا بڑا احسان ہے۔ اب رزق کمانا اور رزق حلال کمانا کا فرق بھی سمجھ لیں۔ اس سے آگے بندہ مومن کا رزق حلال ہے۔ ایک صرف رزق کماتا ہے۔ حلال حرام کی تمیز نہیں رکھتا۔ دوسرا رزق حلال تو کماتا ہے مگر اپنی جدوجہد کے دوران نماز روزہ کو بھول جاتا ہے۔ بندہ مومن حصول رزق حلال کی جدوجہد کے دوران نمازیں بھی پڑھتا ہے، روزے بھی رکھتا ہے ۔تینوں قسم کے اشخاص نے رزق تو بہرحال کمایا مگر پہلے کا رزق حرام کی کمائی ہوا جو ہر سزا کا مستوجب ہوگا۔ دوسرے کا رزق تو حلال تھا مگر ترک صوم وصلاۃ کی سزا کا حقدار ہوگا۔ تیسرے کا رزق بھی حلال ہوا اور اس کے کمانے کی ساری جدوجہد حتیٰ کہ سونا اور آرام کرنا بھی عبادت کے حکم میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے رب تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کر لی جو بڑی کامیابی ہے۔
اسی کو فلاح کہتے ہیں اسی کو فوز عظیم کہتے ہیں۔ رہا رزق تو وہ بھی مل گیا بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے برکت بھی ڈال دی۔ رزق کی برکت بھی ایک بڑی ہی عجیب شے ہے۔ ایک نے ہزار روپیہ کمایا تو بیماری پر خرچ ہو گیا۔ دوسرے نے ہزار روپیہ کمایا تو مقدمے پر خرچ ہو گیا۔ تیسرے نے ہزار ہی کمایا پر اسے بیماری اور مقدمے سے اللہ نے محفوظ رکھا تو اس کے رزق میں برکت آگئی کہ اس میں یہ ہنگامی خرچ نہ پڑے۔ یہ اللہ کا فضل تھا کہ اس کا رزق بچ گیا۔ اور اس کی دیگر مفید ضروریات کیلئے کافی ہو گیا۔ برکت ایک غیر حسی شے ہے۔ ہم برکت ہتھیلی پر رکھ کر آپ کو دکھا نہیں سکتے پر یہ ہے ضرور اور اسے وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے ''قسم کھانے سے مال تو بک جاتا ہے مگر برکت نہیں رہتی''۔

اس فرمان سے ظاہر ہے کہ برکت کوئی چیز ضرور ہے۔اس کا اخلاص عمل سے گہرا ربط ہے۔ہوسکتا ہے یہ کفایت شعاری کا اثر ہو۔نیک لوگ کفایت شعاری سے کام لیتے ہیں اپنے احوال ووسائل احتیاط اور سلیقے سے کام میں لاتے ہیں اللہ کو یہ حزم واحتیاط پسند آتی ہے اور وہ اپنی جناب سے تھوڑے کو بہتا کر دیتا ہے۔

اخلاص کی دونوں مذکورہ بالا صورتیں روح اسلام ہیں انھی سے توحید ورسالت اور اعمال صالحہ کا وجود برقرار رہتا ہے۔جن میں فلاح دارین حاصل ہوتی ہے۔جن سے سکون قلب کی دولت نصیب ہوتی ہے۔جن سے زندگی میں رونق ہوتی ہے۔جن سے ہمیں اپنے گردوپیش میں رحمتوں کا نزول ہوتا نظر آتا ہے۔انھی سے چہرے ہشاش بشاش رہتے ہیں۔توحید دلوں کو منور اور چہروں کو خوبصورت کر دیتی ہے۔سنت سے اعمال کی وہ دلگداز کونپلیں پھوٹتی ہیں اور وہ دلربا پھول کھلتے ہیں جن سے بارگاہ اقدس سے مرحبا کی صدائیں آتی ہیں۔اور اخلاص نیت سے ہماری پوری زندگی کی ساری کاروائی رضائے الٰہیہ کے حصول کا ذریعہ بن جاتی ہے۔اور یہ سمجھ لینا بڑا ہی آسان ہے کہ جس پر اس کا رب تعالیٰ راضی ہوگیا۔تو اسے اِس دنیا اور اس دنیا میں سب کچھ مل گیا۔ہم نے اس تحریر میں دین کے ساتھ ساتھ دنیا کے فائدوں کی طلب بھی درست تسلیم کی ہے مگر جویان رضائے الٰہیہ کی ایک خاص دنیا ہے۔یہ بندگان رب دین ودنیا کے تمام معاملات میں صرف اور صرف رضائے الٰہیہ کے طلبگار ہوتے ہیں۔وہ اس طلب میں اتنے مگن ہوجاتے ہیں۔کہ یہ طلب ان کی روح میں ڈھل جاتی ہے۔

کہ بندۂ مومن جب صرف رضائے الٰہیہ کی تلاش اپنا مقصد حیات بنالیتا ہے تو یہ مقصد ایک غالب جذبہ بن کر اس کی دیگر تمام خواہشات پر چھا جاتا ہے۔میں نے دیکھا ہے کہ تاش کھیلنے والے اپنے کھیل میں اتنے محو ہوتے ہیں کہ بھوک پیاس کا کچھ ہوش انھیں نہیں رہتا۔حتیٰ کہ وہ کئی کئی گھنٹے پیشاب بھی ضبط کئے بیٹھے رہتے ہیں۔یہ اس لئے ہوتا ہے کہ تاش کھیلنے کا جذبہ ان پر اسقدر غالب ہوتا ہے کہ دیگر تمام احساسات مٹ جاتے ہیں۔ہم نے اپنے کئی بھائیوں کو مسجدوں میں اس محویت واستغراق کے عالم میں اپنے رب سے دعائیں کرتے دیکھا ہے کہ انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ سب نمازی جاچکے ہیں۔آخر خادم کو انھیں یاد دلانا پڑا کہ اسے مسجد کے دروازے بند کرنا ہیں۔تب کہیں جا کر ان کا یہ جذبہ ٹوٹا۔میرا خیال ہے کہ جب بعض بندے صرف رضائے الٰہیہ کو اپنا مقصد وحید بنالیتے ہیں تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ خواہشات سے پاک ہو گئے ہیں بلکہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں ان کی یاد نہیں رہتی ہے۔بہر حال یہ فرد سے فرد کا الگ الگ معاملہ ہے اور میرے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو اس پر حجت قائم کر سکے۔البتہ قناعت کی صفت ایسی ہے جس کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔قناعت میسر پر راضی ہونے کا نام ہے مگر زیادہ کی طلب قناعت کے منافی نہ ہے۔کیوں کہ جہاں طلب ختم ہوتی ہے وہاں بے عملی رہ جاتی

ہے جبکہ بے کاری اور بے عملی اللہ کو محبوب نہیں ہیں۔حضور اقدسؐ نے ایک سائل کا پیالہ بیچ کر کلہاڑی تیار کرادی کہ میدان عمل میں اس سے کام کرے اور رزق کمائے اور دست سوال دراز نہ کرے۔سوال، طلب ہے آپؐ نے اس کی طلب پر کلہاڑی نہیں چلائی تھی۔ بلکہ اس کی تکمیل کے واسطے کلہاڑی کا ذریعہ مہیا فرمایا تھا۔اس لئے رضائے الٰہیہ کے طلبگار توکل کے نام پر ہاتھ پاؤں توڑ کر نہیں بیٹھ رہتے اور نہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں۔لوگوں کے اموال کھانا اور پیٹ بھر کر کھانا مگر خود کچھ نہ کرنا اور ملا اور مسند توکل وصبر ورضا سجانا محض کم ہمتی ہے۔جو شخص کسی بھی حوالے سے مال دیگراں بلاسبب کھاتا ہے، اسے متوکل یا قانع نہیں قرار دیا جا سکتا۔کوئی گدائے بے نوا سر بازار گداگری کرتا ہے تو گداگر کہلاتا ہے۔مگر بعض ہوشیار لوگ وہ کام کسی خاص مسند پر بیٹھ کر کرتے ہیں تو متوکل اور صابر وشا کر بھی کہلاتے ہیں۔شیخ سعدیؒ نے ایک حکایت لکھی ہے کہ کوئی بندہ جنگل میں ایک اپاہج لومڑی دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہ کھاتی پیتی کہاں سے ہوگی۔اتنے میں کوئی شیر اپنا شکار منہ میں لئے ادھر آ گیا اور وہاں بیٹھ کر کھانے لگا۔ بہت کچھ کھا کر اس نے اپنی راہ لی مگر اتنا کچھ وہاں رہ گیا جس سے لومڑی نے بھی اپنا پیٹ بھر لیا۔یہ دیکھ کر اس کی فکر نے پلٹا کھایا۔اور وہ بھی اسی جنگل میں مسکن گزیں ہو گیا۔کہ اسے بھی اس لومڑی کی طرح غیب سے رزق ملے گا۔مگر ایسا نہ ہوا اور جب جاں بلب ہوا تو غیب سے آواز آئی تو نے اپاہج لومڑی اور شیر دونوں دیکھے تھے۔تو شیر بن شکار مار، خود بھی کھا اور اپاہجوں کو بھی کھلا۔سو توکل، قناعت اور صبر ورضا کسی طور پر بھی بے عملی کا نام نہیں ہے۔بے عملی، کاہلی اور کم ہمتی اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں۔ہوس وہوا کو الہ بنالینا، ان معنیٰ میں شرک ہے کہ لوگ احکام الٰہیہ کو چھوڑ کر ان سے منہ موڑ کر، اپنے نفس کی خواہشات کے تحت کام کرتے ہیں۔جبکہ رضائے الٰہیہ یہ ہے کہ احکام الٰہیہ کے تحت اپنی خواہشات کی تکمیل کی جائے اور شیطانی خواہشات کو دبا دیا جائے۔کوئی شخص بھوکا ہو تو شکر گزار رہے۔مگر ساتھ حصول طعام کیلئے محنت کرے اور جب مل جائے تو پھر شکر گزاری کرے۔میرے خیال میں رضائے الٰہیہ پر راضی رہنا اسی کا نام ہے۔اگر لباس پھٹا ہو تو شکر گزار رہے مگر نئے لباس کیلئے محنت بھی کرے۔اور نیا لباس پہن کر پھر شکر گزار رہے۔اولاد نہ ہو تو خوش رہے۔ہو تو خوش رہے اور اگر ہو کر مر جائے تو راضی رہے۔یہی راضی برضائے الٰہیہ ہونا ہے۔تن بہ تقدیر ہو رہنا کوئی مستحسن کام نہیں ہے۔سردی تقدیر ہے، اس سے بچنا فرض عین ہے۔رضائے الٰہیہ یہ نہیں کہ بندہ سردی سے مر جائے۔اونٹ کا زانو باندھنا ضروری ہے ورنہ وہ بھاگ جائے گا۔ برتوکل زانوئے اشتر بند کا یہ مفہوم ہی مستحسن ہے۔اسے کھلا چھوڑ دینا توکل نہیں۔ ہاں اسے باندھنا اور اللہ کی حفاظت میں سونپ کر سونا توکل ہے اور اگر پھر بھی بھاگ جائے یا چور اسے لے جائے تو اس پر راضی رہنا، راضی برضا ہونا ہے۔